(غلام گردش)

مہذب رویہ!

تین برس پہلے آسٹریلیا جانے کا اتفاق ہوا۔ حد درجہ عمدہ ملک۔ کافی حد تک شور سے دور۔ امریکہ جیسی گہما گہمی دور دور تک نظر نہ آئی۔ بہت حد تک پُرسکون ملک۔ متعدد پاکستانیوں سے ملاقات ہوئی جو تلاش روزگار کیلئے آسٹریلیا آئے ہوئے تھے۔ ہر طبقے کے تارکین وطن۔ بڑے بڑے افسروں سے لیکر عام لوگوں تک۔ اکثر ملاقاتیں بھول چکا ہوں۔ نہ نام یاد ہیں اور نہ چہرے۔ مگر دو تین ملاقاتیں ایسی تھیں جس سے حد درجہ حیران ہو گیا۔ کافی عرصے تک سوچتا رہا کہ ہم لوگ کس درجہ مشکل ہیں اور ہمارے رویے کتنے عجیب وغریب ہیں۔ پچاس ساٹھ پاکستانیوں سے کھانے پر نشست برپا ہوئی۔ ایک موصوف کہنے لگے کہ دس بارہ سال سے اس ملک میں آئے ہوئے ہیں۔ ٹیکسی چلاتے ہیں۔ ان دس بارہ سالوں میں کبھی بھی شلوار قمیص کے علاوہ کچھ نہیں پہنا۔ کبھی بھی پینٹ کوٹ پہننے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات کم از کم میرے لیے بہت ہی محیر العقول تھی۔ پینٹ کوٹ بھی ایک معتدل لباس ہے اور کُرتا شلوار بھی۔ مغرب میں کیونکہ پینٹ کوٹ عام پہنے جاتے ہیں، وہاں صرف کُرتے شلوار پہننے پر اصرار کرنے کی دلیل کم از کم طالبعلم کی عقل سے حد درجہ بالاتر تھی۔ چند دن کے قیام کے دوران اَن گنت مقامی لوگوں اور پاکستانی تارک الوطن لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ذہن میں صرف ایک خیال اُبھرا۔ آسٹریلیا میں نوے فیصد پاکستانی کسی بھی صورت میں مغربی سوسائٹی کا جزوی حصہ بھی نہیں بن پائے۔

یہ وہ نکتہ ہے جسے سمجھنا قطعاً مشکل نہیں۔ عرض کرتا چلوں۔ ایک مغربی ملک میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک بہت متمول پاکستانی تاجر نے بتایا کہ ہم لوگ جس بھی آبادی میں گھر کرائے پر لیتے ہیں یا خریدتے ہیں، تو نزدیک رہنے والے گورے، وہاں سے اکثر منتقل ہو جاتے ہیں۔ اگر نہ بھی جائیں تو گھروں کی قیمت اور کرائے کم ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر کیوں۔ اس سوال کا جواب بے حد سنجیدہ ہے۔ کہنے لگا، کہ بدقسمتی سے ہم لوگ، پاکستان کے جس بھی حصے سے منتقل ہو کر یہاں آتے ہیں ہم اس حصے کے تمام معاملات کو بھی یہاں ہجرت کروا لیتے ہیں۔ کسی بھی صورت میں مغربی معاشروں کی معاشرتی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہم سڈنی، لندن، نیویارک، سٹاک ہوم اور دیگر شہروں میں انہی شرائط پر رہنا چاہتے ہیں، جیسے پاکستان میں اپنے گاؤں یا شہر میں رہتے تھے۔ اکثریت مغربی معاشروں میں جھانکنے کی کوشش تک نہیں کرتی۔ جن مغربی ممالک کی شہریت کیلئے انہوں نے زندگی قربان کی ہے۔ انکے سماجی رویوں سے مکمل طور پر لاتعلق رہتے ہیں۔ انکشاف میرے لیے حد درجہ نیا تھا۔ اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ اس بزنس مین کی بات کافی حد تک درست تھی۔ ذہن کو دھچکا سا لگا۔ تارکین وطن کی پہلی نسل تو مکمل طور پر اپنے نئے مسکن سے لاتعلق رہتی ہے۔ دوسری نسل ان سے کافی حد تک مختلف ہو جاتی ہے۔ نوجوان بچے بچیاں، انہی سماجوں میں پلتے بڑھتے ہیں۔ انکے سوچنے اور رہنے کا طریقہ کافی حد تک مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ذہنی طور پر پریشان رہتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود کیا ہیں۔ گھر میں کچھ اور دیکھتے ہیں۔ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلتے ہیں، ہر چیز بدل جاتی ہے۔ یہ نوجوان اسی ذہنی انتشار میں رہتے ہیں کہ انکی اصل شناخت کیا ہے۔ ویسے ایک ضمنی بات ہے جو لکھنا نہیں چاہتا مگر لکھے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمارے جو لوگ، مغرب میں منتقل ہوئے ہیں، وہ اپنی جوانی میں وہاں کے سماج سے تمام

لطف حاصل کرتے ہیں۔من مانی کرتے ہیں۔ ہر طریقے سے خوشی حاصل کرتے ہیں۔مگر جیسے ہی اُدھیڑ عمر میں پہنچتے ہیں یا اولاد کی باری آتی ہے تو تمام اعلیٰ اخلاقی اُصول یاد آجاتے ہیں،جن پر انہوں نے خود کبھی عمل نہیں کیا۔بات یہ بھی ہے کہ نہ ہی پاکستان میں ان پر عمل کیا جاتا ہے۔اس بات کو آگے نہیں بڑھانا چاہتا کیونکہ لکھنا دشوار ہو چکا ہے۔

ہمارے لوگ،تلاش معاش یا بہتر زندگی گزارنے کی خواہش لیکر دنیا کے تمام مغربی ممالک میں منتقل ہوتے ہیں۔کم از کم میں نے یہی دیکھا ہے۔امریکہ سے لیکر ساؤتھ افریقہ تک،اور چین سے لیکر برازیل تک۔ہمارے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔مگر اکثریت کسی بھی صورت میں ان معاشروں کا مثبت حصہ نہیں بنتی۔تمام کی بات نہیں کر رہا۔اَسی یا نوے فیصد سے زیادہ لوگ،ان ملکوں کے مقامی لوگوں سے لاتعلق رہتے ہیں۔نتیجہ یہ کہ مغربی گورے نہ ہمیں سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہم انکا ذہن جان سکتے ہیں۔شائد آپکو ایک بات مناسب نہ لگے۔ہمارے جتنے امیر پاکستانی یورپ یا دیگر مغربی دنیا میں گئے ہیں،وہ مقامی پاکستانیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔طبقاتی فرق وہاں بھی بہت زیادہ ہے۔امیر کی دنیا الگ ہے اور اوسط درجے کے لوگوں کی الگ۔ویسے یہ تفریق ہمارے ملک میں تو حد درجہ زیادہ ہے۔امیر کا پاکستان اور ہے اور غریب کا پاکستان اور۔یہی امیر طبقہ جب نیویارک یا لندن جاتا ہے تو وہاں کے مقامی اوسط درجہ کے تارک الوطن سے قطعاً نہیں ملتا۔یہ ایک سماجی المیہ ہے جس پر کبھی بھی کوئی کھل کر بات نہیں کرتا۔کوئی ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔مگر مشکل یہی ہے کہ سماجی فرق بھی باہر منتقل ہو چکے ہیں۔

مرکزی نکتہ یہی ہے کہ ہم لوگ مغربی سوسائٹی کو اجنبی کی طرح دیکھتے ہیں۔اسکے تمام فوائد اُٹھانا چاہتے ہیں۔مگر ان گوروں سے ساتھ ملنا جلنا بہت زیادہ مناسب نہیں سمجھتے۔ہاں ایک اور بات۔مغرب سے ہر طریقہ سے لطف اُٹھانے کے بعد ہمیں وہ مشرقی اقدار یاد آتی ہیں،جنکا عملی وجود ختم ہو چکا ہے یا وہ دم توڑ چکی ہیں۔ایسے ملک،جن میں مذہب کی ذاتی رویہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہے،ہم ضد کر کے مقامی لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ہم تم سے مختلف ہیں۔لو جو کرنا ہے کر لو۔مقامی گورے اس رویے کو سمجھ نہیں پاتے۔حد درجے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔جو چلتے چلتے گھمبیر مسائل پیدا کر دیتی ہیں۔ناپسندیدگی بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔اب یہ ناپسندیدگی،باہمی نفرت کے پیمانے کو چُھو رہی ہے۔شدت پسند ہر سماج میں ہوتے ہیں۔ہمارے ملک میں بھی ہیں اور مغرب میں بھی۔مگر وہاں شدت پسندی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے تارک الوطن،ان سے دور دور رہتے ہیں۔اسکو دین کے زاویے سے نہیں دیکھ رہا۔مگر معاشرتی سطح پر فرق بڑھتا چلا جا رہا ہے۔اسی خلا سے کرئسٹ چرچ کی مساجد پر حملہ کرنے والے مغربی شدت پسند طاقت پکڑتے ہیں۔معاف فرمایئے۔اسی ناسمجھی کے رویے سے بہاولپور میں ایک طالبعلم،خطیب حسین،انگریزی پروفیسر کو چھریاں مار مار کر قتل کر دیتا ہے کہ وہ کالج میں باغیانہ رویے پھیلا رہا ہے۔نیوزی لینڈ میں قتل عام کرنے والا برینٹین ہو،یا بہاولپور میں مقامی کالج کا خطیب حسین،معاملات ایک دوسرے کے خیالات کو نہ سمجھنے کے ہیں۔اپنی سوچ دوسروں پر مسلط کرنے کرنے کا ہے۔انگریزی کے اُستاد،خالد حمید کو قتل کرنے والا طالبعلم اتنا ہی مطمئن تھا،جتنا کہ مسلمانوں کو قتل کرنے والا برینٹن۔عدالت میں گورے قاتل کا عملی رویہ دیکھیں اور بہاولپور میں طالبعلم قاتل کا مقامی پولیس کے سامنے رویہ دیکھیے۔یہ دونوں حد درجہ تک یکساں ہیں۔دونوں،اپنے مطابق،بالکل صحیح کام کر چکے ہیں۔عدالت میں برینٹن

نے جو اشارے کیے، ان سے نسل پرستی برستی ہے۔ خطیب حسین نے پولیس کو جو بیان دیا۔ اس سے ذاتی رجہان کا پتہ چلتا ہے۔ خطیب حسین کہہ رہا تھا کہ پروفیسر کو مار کر بہت اچھا کام کیا۔ پروفیسر کو تو مار ہی دینا چاہیے تھا۔ آپ جاننا چاہینگے کہ پروفیسر نے غلطی کیا کی تھی۔ وہ بدقسمت انسان، کالج میں ایک مخلوط فنکشن کروا رہا تھا۔ کیا یہ واقعی اتنا بڑا جرم تھا کہ اسے مار دیا جاتا؟ مگر برینٹن ہو یا خطیب حسین۔ یہ دونوں رویے قابل مذمت بھی ہیں اور نا قابل قبول بھی۔

سوال تو یہ بھی اُٹھتا ہے کہ کونسے رویے صائب ہیں اور کن کی بیخ کنی کی ضرورت ہے۔ یہ حد درجہ مشکل سوال ہے۔ میرے جیسے طالبعلم کے پاس تو کوئی جواب نہیں ہے۔ شائد کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ مگر نیوزی لینڈ کی وزیراعظم جیکنڈا آرڈرن نے اس سوال کا جواب عملی طور پر دیا ہے۔ اس نے انتہائی مہذب رویے سے دنیا کو بتایا ہے کہ کسی کو بھی اپنے عقیدہ یا ذہنی سوچ کے حوالے سے دوسرے فریق کو نقصان دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ انسانیت سب سے بڑا اور عظیم رویہ ہے۔ اسکے سامنے دوسرے کسی اور رجہان کی حیثیت ہی نہیں ہے۔ یقین نہیں آ رہا تھا، جسطرح وہ دھان پان کی عظیم عورت، مسلمانوں کے دکھ میں شریک ہو رہی تھی۔ نہ اسے ہمارا کچھ اندازہ ہے اور نہ ہی اس نے ہم سے ووٹ لینے ہیں۔ مگر جیکنڈا نے انتہائی اعلیٰ اخلاقی اقدار پر عمل کیا ہے۔ اس نے صرف باتیں اور تقریریں نہیں کیں۔ مسلمانوں کے ساتھ مشکل وقت میں کھڑی ہوئی۔ جیکنڈا کے دیکھا دیکھی پورا نیوزی لینڈ مسلمانوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ گورے گوریوں نے مساجد میں جا کر دورانِ نماز، مسلمانوں کی حفاظت شروع کر دی۔ صرف دو دنوں میں لاکھوں ڈالر کے عطیات اکٹھے ہو گئے۔ متاثرین کے گھروں اور لواحقین کو کھانا پہنچانا شروع کر دیا۔ تدفین کے انتظامات شروع کر دیے۔ متعدد گوری لڑکیوں نے مسلمانوں کے ساتھ یک جہتی کیلئے علامتی دوپٹہ لینا شروع کر دیا۔ سر پر سکارف باندھنا شروع کر دیا۔ جس آسٹریلوی سینیٹر نے مسلمانوں کے خلاف بات کی تھی، اسکو مسلسل انڈے مارنے کیلئے ایک فنڈ بنا لیا۔ پارلیمنٹ میں قران پاک کی تلاوت شروع کروا دی۔ جمعہ کی آذان کو ملکی سطح پر نشر کرنے کے انتظام کر دیا۔ اور ہاں، حفاظتی انتظامات کو بہتر بنانے کیلئے اسلحہ کے قوانین تک تبدیل کر دیے۔ اس مہذب رویے سے نیوزی لینڈ کی وزیراعظم نے وہ کمال کر ڈالا ہے، جسکا ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

معاف فرمایئے۔ ہمارے ملک میں مسیحی لوگوں پر پشاور میں قیامت ڈھائی گئی۔ چند برس پہلے انکے چرچ پر دہشت گردوں نے خون کی ہولی کھیل ڈالی۔ اس وقت کے وزیراعظم کو مسیحی بھائیوں کے ساتھ یکجہتی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بیان بازی بہت ہوئی مگر عملی طور پر کچھ کرنے کا مہذب عملی رویہ سامنے نہ آیا۔ ویسے ہم تو قتلِ عام کے عادی ہیں۔ ہمارے لیے تو کسی کا مرنا یا بہت سے لوگوں کا بیک وقت مرنا محض ایک خبر ہے۔ صرف اور صرف ایک بریکنگ نیوز۔ مگر سوچنا تو چاہیے کہ مغرب اور مشرق میں بڑھتی ہوئی خلیج کو کیسے کم کیا جائے۔ ایک دوسرے کے متضاد ذہنی رویوں کو کیسے سمجھا جائے۔ اپنی روایات کی حفاظت کرتے ہوئے، ذہنی قربت کو کیسے فروغ دیا جائے۔ برینٹن اور خطیب حسین جیسی سوچ کر بالاخر کیسے ختم کیا جائے۔ کیا واقعی اس وقت مغرب اور مشرق کا باہمی ڈائیلاگ نہیں ہونا چاہیے؟ ضرورت تو ہے بلکہ اَشد ضرورت؟ سب سے مہذب رویہ ہی دوسرے کے ذہن کو سمجھنا ہے!

راؤ منظر حیات